مولانا سمیع الحق کو اپنے خطاب میں مختلف القابات سے نوازتے ہوئے کہا کہ مولانا سمیع الحق ' داعی حق ' قائد حق ' اور امام حق ہیں۔ وہ روز اول سے تحریک نفاذ شریعت محمدی کی جدوجہد کے حامی رہے ہیں۔ انہوں نے ہر موقع پر تحریک کی سرپرستی فرمائی ہے ' انہوں نے کہا کہ جمہوری سسٹم کے ہوتے ہوئے اسلامی نظام کا نفاذ ناممکن ہے اس لئے کہ مولانا حامد الحق نے قومی اسمبلی میں شریعت بل پیش کیا لیکن پرائے تو کیا اپنوں نے مخالفت کی اور اس بل کو مسترد کیا۔ انہوں نے کہا کہ مولانا سمیع الحق کے علاوہ ہمارے سیاسی اور مذہبی جماعتوں کے تمام قائدین اور رہنما اس کفری نظام کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں۔ مولانا صوفی محمد نے کہا کہ اسلامی نظام کے بغیر معاشرہ میں امن خوشحالی اور انصاف مہیا کرنا قطعاً ناممکن ہے انہوں نے علماء پر زور دیا کہ وہ خدارا اس کفری نظام سے باہر نکل کر اسلامی نظام کے لئے عملی جدوجہد شروع کریں بعد میں جمعیت کے مقامی رہنما حاجی گل نے وفد کے اعزاز میں اپنی رہائش گاہ پر ظہرانہ دیا جسمیں تمام شرکاء وفد نے شرکت کی۔ (۱۶ اپریل ۲۰۰۹ء۔ قومی اخبارات)

علماً ، خطباً ، طلباً اور عام مسلمانوں کے لئے عظیم الشان

خوشخبری

شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق ؒ کے خطبات وافادات کا عظیم الشان مجموعہ علم وحکمت

دعوات حق (مکمل دو جلدوں میں)

مرتبہ **مولانا سمیع الحق** مدظلہ ، مہتمم دارالعلوم حقانیہ

نایاب ہونے کے بعد اب سہ بارہ شائع ہوگئی ہے۔ آج ہی حاصل کیجئے ورنہ اسکی نایابی پر ایک بار پھر افسوس کرنا پڑیگا

دعواتِ حق: ایک ایسا گنجینہ جسے اہل علم خطباً واعظین اور تعلیم یافتہ طبقہ نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور قومی وملی پریس نے سراہا۔ جو ہر خطیب واعظ مقرر کے لئے پکی پکائی روٹی کا کام دیتا ہے جو رشد وہدایت احسان وسلوک کے متلاشیوں کیلئے شیخ کامل کا کام دیتا ہے۔ **دعواتِ حق:** دین شریعت اخلاق ومعاشرت علم وعمل عروج وزوال نبوت ورسالت شریعت وطریقت کے ہر ہر پہلو کو سمیٹے ہوئے ہے۔ **دعواتِ حق:** شیخ الحدیث محدث ومجاہد کبیر مولانا عبدالحق ؒ کی عام فہم اور دردوسوز میں ڈوبی ہوئی گفتگو اور خطابت کا ایسا مجموعہ ہے جو دلوں میں اتر کر یقین کو بیدار کر کے اصلاحی وایمانی انقلاب برپا کر دیتا ہے۔

☆ فضلاً ' علماً ' طلباً اور اہل مدارس کیلئے خاص رعایت

☆ صفحات جلد اول: ۶۷۲۔ قیمت ۔/۲۶۰ روپے۔ صفحات جلد دوم ۵۰۲۔ قیمت ۔/۲۰۰

موتمر المصنفین دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ' ضلع نوشہرہ ' پشاور

سفر افغانستان کے چند پراگندہ نقوش

حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ

افغانستان : روئے زمین پر حق و باطل کی سب سے اہم رزمگاہ

غزنوی اور ابدالی کے دیس میں

بلخ کے کھنڈرات یا علم و حکمت کے دفینے

حضرت مولانا سمیع الحق مدظلہ کی مصروفیات کی وجہ سے اس دفعہ ان کا سفرنامہ حرمین الشریفین شامل اشاعت نہ کر سکے' اس کی کچھ نہ کچھ تلافی مولانا مدظلہ کی کافی عرصہ پہلے سفر کابل کے بارہ میں لکھی ہوئی تحریر پیش کر رہے ہیں۔ دشمن کے ہاتھوں تباہ حال افغانستان کی بربادی اور کافروں کی یلغار کے بارہ میں مولانا مدظلہ کے احساسات' خدشات اور وہاں کی حالت زار پر روشنی پڑتی ہے' خدا کرے مولانا مدظلہ کو اس سرگزشت کو بھی مکمل کرنے کا موقع مل جائے......(ادارہ)

آج ۲۲ رجون ۱۹۷۱ء ہے اور عالم اسلام کے بطل جلیل مجاہد اعظم سلطان محمود غزنویؒ کے شہر میں جانے کا پروگرام ہے، غیور مسلمانوں کی سرزمین، افغانستان میں ہماری آمد کا دسواں دن ہے، برادر محترم قاری سعید الرحمٰن صاحب راولپنڈی بھی اس سفر کے ساتھی ہیں بابر اور ابدالی کے دیس، مجاہد اسلام محمود غزنویؒ کے وطن افغانستان کی زیارت کی دیرینہ آرزو تھی، ہمارے پڑوس کے یہ مغربی خطے کبھی ہمارے میراث علم و حکمت کے علمبردار و امین تھے دین و دانش کی شعائیں ادھر ہی سے مشرق کو مالا مال کرتی تھیں پھر غلام ہندوستان کے زمانہ میں بھی یہی خطہ اور غیور افغانوں کا چھوٹا سا ملک حریت اور جہاد آزادی کا مدرسہ بنا ہوا تھا اور گویا ایشیا کا یہ بلجیم کمزور قوموں کی قوتوں کا معیار اور اپنی آزادی کا آپ محافظ رہا، یہ جیالے افغانوں کا وطن ہے جنہوں نے عظیم برٹش امپائر کے استعماری عزائم کو مدتوں خاک میں ملائے رکھا جہاں خلافت راشدہ کے ابتدائی ادوار ہی میں اسلام کا نور پہنچا اور بحیثیت قوم پوری ملت افغانیہ نے اسلام کو لبیک کہا، مغرب پورے جاہ و جلال کے ساتھ بھی اسے غلام نہ بنا سکا اور ایک عرصہ تک مغربیت کی پوری زور آزمائی کے باوجود اسلامی شریعت کی روح یہاں کارفرما رہی۔ مگر آج کا افغانستان اتنے ہی جوش اور ولولہ سے مغرب کی مادہ پرست تہذیب سے بغلگیر ہو رہا ہے اور مشرقی یورپ کے راستے سے آئی ہوئی مغربیت گویا اپنی سحر کاریوں میں دوآتشہ ثابت ہو رہی ہے، مغرب سے مقابلہ آسان تھا مگر مغربیت عالم اسلام کے لیے اس دور کا سب سے بڑا فتنہ ثابت ہوا کس کی تاب تھی کہ اس کی چکاچوند کے سامنے ٹھہر سکتا اور ایسا کیوں نہ ہو قیامت سے پہلے اس تہذیب ہی کی کوکھ سے نکلنے والا فتنہ دجال ہی تو ہوگا جو پورے عالم اسلام کو دام تزویر میں لے لیگا۔ پچھلے دس دنوں میں ہم نے کابل اور اس کے

گردونواح میں بہت کچھ دیکھا۔شمال مغرب میں سینکڑوں میل دور تک ترکستان جانا پڑا، مزار شریف (جو حضرت شاہ ولایت مآب علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کو منسوب ہے) کی زیارت ہوئی، اور اس سے ذرا دور روسی سرحد کے سایہ میں وہ ویرانہ بھی دیکھا جو کبھی بلخ کے نام سے عالم اسلام کا مرکز علم وسیاست بنا ہوا تھا جہاں سے علم وحکمت کے چشمے پھوٹ کر عالم اسلام کے دل ودماغ کی حیات نو کا ذریعہ بنتے تھے اس کے جنوب میں دریائے آمو (جیحون) واقع ہے اس علاقہ میں آریائی تہذیب وتمدن پروان چڑھی، زردشت کی مذہبی آتش پرستی نے یہاں رواج پایا اور اُس دور کا سب سے بڑا آتش کدہ یہیں بنایا گیا، تاریخ کے ہر دور میں بلخ نے اپنے اثرات چھوڑے، اور بلخ، باکتر، بان، نجدی، باختر، بلہیکا، باغل، پامیک، بلخ بامی، زراسب اسی کے مختلف نام رہے پھر عہد فاروقی میں اسلامی افواج کی ترک تازیوں کا مرکز بنا، خراسان کے یہی خطے تھے جو حضرت فاروق اعظمؓ کے زمانہ ۲۳ھ/۶۴۴ء میں ان کے بھیجے ہوئے ایک سالار حضرت احنف ابن قیس اور ان کے جانباز ساتھیوں ربعی بن عامر التمیمی، عبداللہ بن ابی عقیل الثقفی، ابن ام غزال الھمدانی جیسے بہادر شاہ سواروں کی آماجگاہ بنے، شہنشاہ فارس یزدگرد جو بلخ میں پناہ لیے ہوئے تھا یہیں سے خائب وخاسر ہوکر دریائے جیحون کے راستہ خاقان کی حکومت میں بھاگ نکلا، اور حضور ﷺ کے ایک بہادر سپاہی حضرت احنف کے ہاتھوں نیشاپور سے طخارستان تک اسلام کا علم لہرانے لگا یہیں حضرت احنف کے ۲۴ ہزار سربکف مجاہدین نے خاقان کے عزائم خاک میں ملادیئے اور اسے شکست فاش اٹھانی پڑی، قلمرو اسلام میں آنے کے بعد بلخ سامانی، غزنوی، سلجوقی اور صفاری سلاطین کی توجہات کا مرکز اور بسا اوقات پایہ تخت رہا اور ایک زمانہ ایسا آیا کہ اس شہر میں ایک ہزار دینی دارالعلوم بارہ سو جامع مسجدیں اور بارہ سو حمام آباد تھے، علم وہنر، سیاست وحکمت، طب وفلسفہ، ادب وتصوف میں نابغہ روزگار شخصیتیں ان خطوں نے اسلام کو دیں اللہ کی طرف سے عیش وعشرت میں ڈوبی ہوئی قوموں کے لیے جو تازیانے مقرر ہیں، وقفہ وقفہ سے وہ بھی برستے رہے، اور بلخ بائیس ۲۲ مرتبہ بہت بڑی تباہی اور تخریب کا نشانہ بنا، یہاں تک کہ ۱۲۲۰ء بمطابق ۶۱۷ھ میں چنگیز خان کی فوجیں آئیں اور وحشت وبربریت میں تمام بربادیوں کو مات کرگئیں، آج یہ شہر مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے مگر اس کے اس پار بخارا اور سمرقند، خوارزم اور فرغانہ اس دور کی سرخ چنگیزیت کے پنجہ غلامی میں جکڑے ہوئے ہیں ___ الغرض بلخ قبۃ الاسلام اور ام البلاد نے اسلام کے عہد عروج میں ایک مثالی کردار ادا کیا اور اس سرزمین کے کنارے دریائے آمو (جیحون) بہتا ہے جو آج اس سرخ چنگیزیت کے سامنے سراب کی مانند ایک لکیر بنی ہوئی ہے اور اس سے ذرا دور ہٹ کر وہ دریا بہتا ہے جسکا کبھی ماوراء النہر کے نام سے پوری اسلامی دنیا کے علم وحکمت کے ایوانوں میں غلغلہ رہا ہے یہاں کے علماء اور فقہاء اپنی فقاہت وحکمت اور علمی تبحر کے لحاظ سے عالم اسلام کیلئے ایک ممتاز مکتب فکر بن گئے تھے۔

اب ذرا چشم تصور سے دریا کے اس پار نگاہ دوڑایئے وہ سامنے بخارا اور سمرقند ہے، امام بخاریؒ کا مدفن جن کی کتاب

بخاری مسلمانوں کے ہاں اللہ کی کتاب کے بعد دوسرے نمبر پر ہے امام ترمذیؒ کی بستیاں صاحب ہدایہ ان علاقوں ہی میں فقہ کے دریا لنڈھاتے تھے یہاں سے حدیث اور فقہ کو تازگی اور زندگی ملتی رہی آج بھی ہماری گردنیں جن کے احسانات میں دبی ہوئی ہیں ہم نے جو کچھ پایا ان ہی علاقوں سے۔ یہ اسلام کے امین تھے مگر آہ! اب وہاں کیا ہے؟ اپنے جلیل القدر امام بخاریؒ کا مدفن، ترمذی کا مولد اور صاحب ہدایہ کا منشاء شاید وہاں کے باسیوں میں سے بھی کسی کو معلوم نہیں ہم پردیسیوں کے تو وہاں نزدیک جانے سے بھی پَر جل جائیں گے، وتلک الایّام نداولھا بین الناس.

تو بلخ کے کھنڈرات پر کھڑے ہو کر خوب آنسو بہائیے اور سرخ سرحد کے اس پار اپنی عظمتوں کے مزار پر ایک نگاہ حسرت ڈالئے وہ دیکھئے آج بخاریؒ اور ترمذیؒ کی سعید روحیں کتنی بے چین ہیں انکی نوجوان نسلوں کو شاید اسلام سے اتنا تعلق ہو کہ ہمارے آباؤ اجداد مسلمان کہلاتے تھے بڑے بوڑھے اپنے ایمان کی دولت بچانے کی خاطر سب کچھ لٹ لٹا کر دوسرے ملکوں میں پناہ گزین ہو گئے اور زیادہ تر روسی استبداد کا نشانہ بن گئے۔ صد حیف کہ کیسی کیسی متاع بے بہا ہمارے ہاتھوں شامت اعمال کی وجہ سے لٹ گئی اور سرحد کے اس پار یہ بلخ ہے، یہ بھی تو اس وقت عہد ماضی کا ایک شکستہ ساز رہ گیا ہے یہاں کے باسیوں میں سے اکثر کو معلوم ہی نہیں کہ آج بھی اس کے گرداگرد اور اہم چوکوں کے قریب علم وحکمت کے کیسے کیسے خزانے مدفون ہیں، کبھی یہاں کے طاق وایوان قال اللہ اور قال الرسول سے گونجتے تھے اور اب زوال پذیر قوموں کی طرح اونگھتے ہوئے اپنی عظمت سے بے فکر باشندوں کی پناہ گاہیں بنی ہیں۔ کبھی ہر گلی مدرسہ تھا اور ہر گھر خانقاہ، اولیاء کا ہجوم اور ائمہ عصر اساطین علم وفقہ کا اژدحام، اور آج نہ کوئی مدرسہ ہے نہ خانقاہ نہ کوئی عالم معلوم نہ کسی استاد کا چرچا، اس لیے حال کی تلاش سے کیا فائدہ، ماضی کے تجسس میں نکل جایئے، قلب ونظر کی تسکین کا کچھ سامان شکستہ کھنڈرات ہی سے مل سکے گا، ماضی سے کٹے ہوئے حال نے تو بدحالی کے یہ دن دکھائے، تو دیکھئے وہ شیخ الاسلام سلطان احمد خضرویہؒ کی ٹوٹی پھوٹی قبر ہے جو ۲۴۰ھ میں ابراہیم ادہمؒ، بایزید بسطامیؒ اور امام حاتم اصمؒ کے معاصر تھے، تصوف اور معرفت کی کتابیں ان کے حالات عالیہ کے ذکر سے لبریز ہیں۔ کرامت اور علو مرتبت کا یہ عالم کہ بسا اوقات جہاں قدم پڑتا وہاں سبزہ اگا دیتی مگر یہ کونسی بڑی بات ہے یہ لوگ تو مردہ دلوں کو حیات جاودانی بخشتے تھے، خاک انکی نظر سے کیمیا ہو جاتی تھی ذرا دائیں جانب ہٹ کر ان کی پاکباز رفیقہ حیات خاتون کا مزار ہے چاروں طرف دیواروں اور گنبد سے ڈھکا ہوا، اندر جانے کا راستہ نہیں۔ اس لیے کہ یہ اس زمانہ کی خاتون تھیں جو عفت وحیاء، خوف خدا اور ایمان ویقین کا پیکر ہوا کرتی تھیں جاتے جاتے وصیت کر بیٹھیں کہ میری قبر کو چاروں طرف سے عمارت میں ڈھانک دیا جائے کہ بعد از مرگ کسی غیر محرم کو قبر پر بھی نگاہیں ڈالنے کا موقعہ نہ ملے، بیشک یہ ان مومنات قانتات میں سے ہوں گی جن کی پاکیزگیوں کو اللہ پاک نے قرآن میں سراہا ہے، وہ رونق محفل بننے والوں میں سے نہ تھیں، بلاشبہ اس زمانہ کی خواتین مرد سے مساوات کے قائل نہ تھیں مگر ایسی صفات کی بدولت اللہ انہیں نہ صرف مساوی بلکہ

سوئی لیے پانی میں ابھر آئیں ابراہیمؒ نے سونے پر نگاہِ حقارت ڈالتے ہوئے کہا مجھے اس کی کیا ضرورت اس متاع کی تو میرے ہاں فراوانی تھی مگر میں نے اسے سکون واطمینان اور وصال حقیقی کی لازوال دولت کے بدلے ٹھکرا دیا ہے اب مچھلیوں نے دوبارہ غوطہ لگایا اور ایک مچھلی منہ میں وہی سوئی لیے ہوئے ابراہیمؒ کے قدموں میں ڈال آئی اور اس طرح ابراہمؒ نے اپنی والدہ کو سمجھانا چاہا کہ اماں جان یہ سلطنت اچھی ہے یا توپ وتفنگ اور سیم وزر کے زور سے جو چند آدمیوں کے صرف جسموں پر قائم ہوتی ہے یہ تو قلوب کی حکمرانی ہے اور انسانوں پر ہی نہیں بلکہ حیوانات تک پر حاوی ہوتی ہے ایسے لوگوں کے لیے تو دریاؤں کی مچھلیاں، صحراؤں کے وحوش اور فضاؤں کے پرندے بھی دعا گو رہتے ہیں کہ ان کی دم خم سے تو اللہ کے نام کا چرچا اور ان کی رونق سے کائنات آباد رہتی ہے۔

روبدو کرد وبگفتش کا ے امیر ملک دل بہ یا چنیں ملک حقیر

ایں نشان ظاہرست ایں ہیچ نیست باطنی جوئی بظاہر برمایست

یہ ابراہیم ادہمؒ کا قصہ تھا بارہا اسکے سننے کا اتفاق ہوا مگر رات کی مجلس میں سنانے والا مثنوی مولانا روم کا ایک دلدادہ تھا، پڑھنے کا عجب انداز، ڈوب کر سنا رہا تھا، عجیب سوز وگداز، اور لکھنے والے مولائے روم۔ مثنوی نے جنہیں زندہ جاوید بنا دیا ہے اور جن کا پاکیزہ خمیر بلخ ہی کی سرزمین سے اٹھایا گیا، آباواجداد اسی بلخ کے رہنے والے تھے صدیوں تک عقلیت والحاد کی بنیادوں پر کاری ضرب لگانے والا جلال الدینؒ ۶ ربیع الاول ۶۰۴ھ کو اسی شہر کے ایک خدارسیدہ ذی اثر بزرگ محمد بہاؤالدینؒ کے گھر میں پیدا ہوا۔ آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی شان وشکوہ کی بے وقعتی اور راہ عشق میں ترک مال ووطن ورثے میں پایا تھا انکے والد بزرگوار کے اثر ورسوخ سے جب سلطان وقت خوارزم شاہ گھبرا گیا تو خزانوں کی کنجیاں بھی انکے قدموں میں ڈال دیں کہ دلوں کی حکمرانی تو تجھے حاصل ہے میرے پاس ان کنجیوں کے سوا رہ کیا گیا ہے؟ آپ نے جواب میں کہا ہم سرمستان بادہ الست کو ان چیزوں سے کیا سروکار، سلطنت بھی تجھے مبارک ہو اور خزانے بھی آپکو ناگوار ہے تو فقیر چلا جاتا ہے مگر جاتے جاتے خطرہ کا الارم دے گئے کہ میرے بعد لشکر تاتار آرہا ہے۔

الغرض اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر تاج وسلطنت کو حقیر سمجھنا اور حقیقی عشق تو مولانا رومؒ کو ورثے میں ملا تھا پھر ابراہیم ادہمؒ کے ذکر میں وہ کب صاحب قال رہے صاحب حال تھے نہ صرف اسی واقعہ کے بیان میں بلکہ ان کی مثنوی تو اول تا آخر مردہ قلوب کے لیے پیغام حیات ہے اور کیوں نہ ہو جب اس کا سرچشمہ وہ عشق آفرین طبیعت ہے جو اپنی پرجوش اور پرسوز حالت سے اس طرح پردہ اٹھاتے ہیں۔

شعلہا آخر زہر مویم و مید ازرگ اندیشہ ام آتش چکید

مقام عشق وبے خودی میں ہربُن موگویا ہے کہ

درجہاں یارب ندیم من کجاست نخل سینایم کلیم من کجا ست

اس آتش فشاں سے نکلے ہوئے شعلے تھے جنہوں نے صدیوں تک عقل پسندی، تجدد اور خرمن الحاد وظاہر پرستی کو خاک

مردوں سے بڑھا بھی دیتا تھا، ولیس الذکر کاالانثیٰ۔

شیخ الاسلام خضرویہ" کے مزار سے ذرا جانب مشرق چلے جایئے، یہاں صالحین کے ایک جھرمٹ میں خواجہ ایوب انصار" آسودہ استراحت ہیں، یہ اپنے وقت کے ممتاز و معروف عالم و عارف خواجہ عبیداللہ انصار" کے والد ماجد ہیں، خود بھی بڑے ولی اور عارف کامل خواجہ عبیداللہ کا مزار ہرات میں ہے۔ایں خانہ ہمہ آفتاب ہیں، اردگرد قبور کے نشانات ہیں، کچھ بوسیدہ کتنے جو پڑھے نہیں جاسکے مگر ہماری مجد و شرف کی کیا کیا نشانیاں خاک کے ان ڈھیروں میں پنہاں ہوں گی۔اس خطہ صالحین سے ذرا آگے بڑھیں تو سڑک چھوڑ کر قاضی ابومطیع بلخی" کے مزار پر حاضری دیں یہ اپنے وقت کے ممتاز عالم قانون اسلامی اور شریعت کے امام تھے، نام عبدالحکیم بن عبداللہ کنیت قاضی ابومطیع ،منظوم کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ" اور قاضی ابو یوسف" وامام محمد" کے رفیق طریق تھے، تاریخ وفات اشعار میں ''جہانِ علم'' ۱۹۹ قمری ہجری لکھی ہے، اب ہمارا بردبار اور معمر تر کستانی قائد جسے مزار شریف کے متولی وخطیب اور وہاں کے دیگر علماء نے ہمارے ہمراہ کیا ہے، ہمیں فقیہ امت ابواللیث سمرقندی" کے مزار پر لے گیا، فقیہ ابوجعفر ہندوانی کا یہ قابل فخر شاگرد نصر بن محمد بن احمد السمر قندی" فقہ حنفی کا اہم ستون ہے۔اپنے وقت میں امام الہدیٰ کے لقب سے علمی دنیا سے خراج تحسین حاصل کیا، فقہ حنفی اور دیگر علوم میں بیشمار کتابیں تصنیف کیں، کتب تذکرہ میں انکی کئی کتابوں، تنبیہ الغافلین، البستان، شرح الجامع الصغیر، النوازل والعیون والفتاویٰ، خزانۃ الفقہ، مقدمۃ فی الفقہ، تفسیر القرآن، فتاوی ابواللیث، وغیرہ کا ذکر ملتا ہے، علمی وفقہی حلقوں میں آج بھی ان کے فتاویٰ اور اقوال کی بازگشت سنائی دیتی ہے، شہر بلخ سے باہر ۳۷۶ھ مطابق ۹۸۵ء یا ۳۷۳ھ یا ۳۷۵ھ یا ۳۹۳ھ میں وفات پائی، ان کی علمی عظمتوں کے سامنے گردن سرنگوں ہوجاتی ہے اور آج بھی رہا سہا جو کچھ مسلمانوں کے پاس ہے ایسے ہی بزرگوں کی محنتوں کا ثمرہ ہے۔مزار کے شکستہ تختہ پر بائیں جانب ایک اور قبر ہے جو کسی عالم اور حبر امت ہی کی ہوگی، مگر نام ونشان نامعلوم فقیہ ابواللیث" کے سرہانے کتبہ بھی گردش ایام کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ گیا ہے اس پر دو ایک سطریں باقی ہیں جو مشکل سے پڑھی جاتی ہیں، اپنی عظمت رفتہ کے آثار کی حفاظت غیور قوموں کا شیوہ ہے مگر خدا معلوم افغانستان کی حکومت کبھی ان آثار کی حفاظت کی طرف توجہ دے بھی سکے گی یا نہیں، کلچر اور ثقافت کے جشنوں پر لاکھوں روپے اڑانے والی قومیں اپنی اصل تہذیب وتمدن کی بنیادوں کی طرف کم ہی متوجہ ہوا کرتی ہیں اور اپنے ماضی سے بے خبر ملکوں کے عجائب خانوں کی رونق فراعنہ کے آثار، گوتم بدھ کے نقوش اور کنشک کے گھسے پھٹے باقیات ہی سے ہوتی ہے، الغرض دونوں قبریں کھلے میدان میں اور بلخ کے اکثر مزارات کی طرح گوشہ گمنامی میں بدعات ورسوم سے دور مزار غریباں بنی ہوئی ہیں، اللہ کی شان جن لوگوں کی زندگی اتباع سنت کی تلقین ظواہر شریعت کی حفاظت اور بدعات ومنکرات سے جہاد میں گزری عموماً ان کی قبروں کو بھی اللہ نے ان خوبیوں سے محفوظ رکھا یہ ایک ایسا صلہ ہے کہ خالص اپنے رب کے ہونے والے بندوں کو دنیا میں بھی مل رہا ہے، ایک اور سمت

بنائے رکھا، اور مولانا روم کے الہامی نغمے تھے جن کی حرارت و شدت نے عالم اسلامی کے فکری تعطل اور جمود کو پگھلا کے رکھ دیا بہر حال مثنوی کیا ہے، محبت کا لافانی پیغام سوز و گداز اور جذب و مستی کی متاع اور ایمان و غیب کے لیے اپنے وقت کا ایک نیا علم الکلام، جس نے کتنوں کو راہ ہدایت دکھائی اور کتنوں کو منزل تک پہنچا کے چھوڑا، سچ کہا ہمارے فلسفی اور صاحب دل شاعر اقبالؒ نے کہ وہ بھی انہی لوگوں میں تھے جنھوں نے مثنوی سے نیا فکر نیا جوش اور نئی زندگی پائی۔

پیر رومی مرشد روشن ضمیر   کاروان عشق و مستی را امیر
نور قرآن درمیان سینہ اش   جامِ جم شرمندہ از آئینہ اش
رومی آں عشق و محبت رادلیل   تشنہ کامان راکلامش سلسبیل

ایک پورے عہد کے لیے مجدد کا یہ تجدیدی کارنامہ آج بھی ہمارے پاس موجود ہے مگر وہ جنہیں اقبالؒ نے پیر رومی کو رفیق راہ بنانے کا مشورہ دیا تھا ان میں سے کتنے ہیں جنھیں اس کی خبر تک بھی نہیں ہے؟ جن کی ساری مجلس آرائی آرٹ، ثقافت، جنسیات، افسانوں اور فحش ڈراموں پر موقوف ہے انہیں مثنوی جیسے حیات آفرین پیغام سوز و گداز کی لذت کیا معلوم، مثنوی کی جگہ ٹیلی ویژن اور ریڈیو نے لے لی، قلب و نظر کی تسکین مولائے روم کی جگہ شکسپیئر، ملٹن اور گوئٹے میں ڈھونڈی جانے لگی۔ ہمارے بزرگ مثنوی جیسے پاکیزہ علم و ادب سے عقل و فلسفہ کی کدورتیں دور کرتے تھے آج ہم میکیاولی، ڈارون، فرائڈ کی ہلاکت گاہوں میں اپنی نگاہ و بصیرت ڈھونڈ رہے ہیں بیماریوں کے سرچشموں سے صحت کی تمنا مسلمان قوم کا شیوہ تو نہ تھا۔ یورپ کے دبستان سے دلوں کی سوز نگاہوں کی پاکی، فکر و نظر کی سلامت روی کی توقع رکھنا ایک ایسی بات جو اس وقت پورے عالم اسلام پر خندہ استہزا کر رہی ہے۔

بات کہاں سے کہاں جا پہنچی، ذکر ابراہیم ادہم کے والد ماجدؒ کے مزار پر حاضری کا ہو رہا تھا، مزار کے کھنڈرات کسی زمانہ میں عمارت کے حسن و شوکت کی غمازی کر رہے تھے اب صرف شکستہ طاق اور گنبد رہ گیا ہے، سامنے ایک قدیم اور بلند و بالا چنار کا درخت ہے جو ہماری عظمت رفتہ کی حسرتناک تصویر بنا نہ معلوم کب سے ''عہد رفتہ'' کو آواز دے رہا ہے، اور گویا مثنوی کے انداز میں نالہ کناں ہے۔

ایھا النور فی الفواد تعال   غایۃ الوجد والمراد تعال
ایھا السابق الذی سبقت   منک مصدوقۃ الوداد تعال

ایک طرف سے آواز آئی کہ۔

نشان لالہ ایں باغ ازکہ می پرسی   بروکہ آنچہ تو دیدی بجز خیال نماند

رہرو نے چنار کے درخت سے گزرنے والوں کا کچھ حال دریافت کرنا چاہا کہ اتنے میں میر کے الفاظ میں۔

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشان   مُشتِ غبارے کے صبا نے اڑا دیا